کشمیر: بھارتی فسطائیت اور مضمرات

افتخار گیلانی

نریندر مودی کی بھارتی حکومت نے اپنے طور پر مسئلہ کشمیر ختم کرنے کے لیے آخری وار کر دیا۔ ان کے وزیرداخلہ امیت شا نے پارلیمنٹ میں بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ اور دفعہ ۳۵-اے کو ختم کر دیا۔ اس طرح ریاست کو تحلیل کرنے اور اس کو تقسیم کر کے مرکز کے زیرانتظام دو خطوں میں تبدیل کرنے کا قانون بھی پاس کیا۔ اب لداخ، جو مسلم اکثریتی ضلع کرگل اور بودھ اکثریتی لیہ اضلاع پر مشتمل ہے، وہاں اسمبلی نہیں ہوگی۔ ۹۰ کے عشرے میں اس خطے کی ۳۹ء۶۵ فی صد بودھ آبادی نے لداخ کو مرکز کے زیر انتظام علاقہ بنانے کا مطالبہ کیا تھا، مگر اس خطے میں آباد ۴۶ء۴۰ فی صد مسلم آبادی نے اس کی شدید مخالفت کی۔ حیرت کا مقام ہے کہ جب دانش ور حضرات اور میڈیا جس میں پاکستانی میڈیا بھی شامل ہے، بے خبری میں لداخ کو بودھ اکثریتی علاقہ تصور کرتے ہیں۔

جموں و کشمیر بھی مرکز کے زیر انتظام ہوگا، جس میں اسمبلی تو ہوگی، مگر وہ دہلی و پانڈیچری اسمبلی کی طرز پر ایک میونسپل کارپوریشن کی طرح کام کرے گی۔ تمام تر اختیارات مرکز کے نمایندے گورنر کے پاس ہوں گے۔ کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کو معطل کر دیا گیا ہے۔ اور بیوروکریسی کا تعین مرکز حکومت کرے گا۔ معروف دانش ور مزمل جمیل کا کہنا ہے کہ: ''کشمیر میں تاریخ کا پہیہ واپس ۱۸۴۶ء میں پہنچ گیا ہے، جب 'بیع نامہ امرتسر' کے بعد ڈوگرہ حکمران گلاب سنگھ نے سرینگر کی باگ ڈور سنبھالی''۔

ریاست جموں و کشمیر کو تحلیل کرنے اور اس کو بھارتی یونین میں ضم کرنے کے حکم نامے کی سیاہی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کے لیڈروں بشمول ہریانہ صوبہ کے وزیراعلیٰ منوہر لال کھٹر نے اعلان کیا: ''بھارت کے کنوارے نوجوان اب کشمیر کی

گوری لڑکیوں کے ساتھ شادیاں کر سکتے ہیں''۔ اس طرح کے طنز آمیز آوارگی، جنسی اور نسلی تعصب سے لتھڑے ہوئے جملے بھارت کے گلی کوچوں میں سنائی دے رہے ہیں۔ کئی ساہوکار اور بنیے تو فون پر گلمرگ اور سونہ مرگ کی وادیوں میں زمینوں کے بھاؤ پوچھ رہے ہیں۔

۱۹۹۰ء کے عشرے کے شروع میں تعلیم اور روزگار کے لیے میں جب میں دہلی وارد ہوا، تو ایک روز معلوم ہوا، کہ کانسٹی ٹیوشن کلب میں ہندو قوم پرستوں کی سرپرست تنظیم راشٹریہ سیویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کی طلبہ تنظیم 'اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد' (ABVP) کی طرف سے کشمیر پر مذاکرہ ہو رہا ہے۔ بطور سامع میں بھی وہاں چلا گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک اعتدال پسند لیڈر ارون جیٹلی خطاب کر رہے تھے۔ وہ ان دنوں ابھی بڑے لیڈروں کی صف میں نہیں پہنچے تھے اور تب تک سپریم کورٹ کے زیرک وکیلوں میں ہی شمار کیے جاتے تھے۔ چونکہ وہ مقتدر ڈوگرہ کانگریسی لیڈر گردھاری لال ڈوگرہ کے داماد ہیں، اس لیے جموں وکشمیر کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ اپنے خطاب میں جیٹلی صاحب کا شکوہ تھا کہ: ''پچھلے ۵۰ برسوں میں مرکزی حکومتوں نے کشمیر میں غیر ریاستی باشندوں کو بسانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر ہندستان کے دیگر علاقوں سے لوگوں کو کشمیر میں بسنے کی ترغیب دی گئی ہوتی، اور اس کی راہ میں قانونی اور آئینی پیچیدگیوں کو دُور کیا جاتا، تو کشمیر کا مسئلہ کبھی بھی سر نہیں اٹھاتا۔ اسی طرح کشمیریت اور کشمیری تشخص کو بڑھاوا دینے سے کشمیری نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو برتر اور الگ سمجھتے ہیں اور ہندستان میں ضم نہیں ہو پاتے ہیں''۔

اسی طرح مجھے یاد ہے کہ کانگریسی رہنما من موہن سنگھ کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں ایک بار پارلیمنٹ میں کشمیر پر بحث ہو رہی تھی۔ تب بی جے پی نے اتر پردیش کے موجودہ وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کو بطور مقرر میدان میں اتارا تھا۔ تقریر ختم کرنے کے بعد وہ پارلیمنٹ کمپلیکس کے سینٹرل ہال میں آکر سوپ نوش کر رہے تھے، کہ میں نے جاکر ان سے کہا کہ: ''آپ نے بڑی دھواں دھار تقریر کر کے حکومت کے چھکے تو چھڑائے، مگر کوئی حل پیش نہیں کیا''۔

یوگی جی نے مسکرا کر مجھے کہا کہ: ''اگر میں حل پیش کرتا تو ایوان میں آگ لگ جاتی''۔

میں نے پوچھا کہ ''ایسا کون سے حل ہے کہ جس سے دیگر اراکین پارلیمان بھڑک جاتے؟''

آدتیہ ناتھ یوگی نے فلسفیانہ انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے

نتیجہ اخذ کیا کہ: ''مسلمان جہاں بھی اکثریت میں ہوتے ہیں یا ان کی آبادی کچھ زیادہ ہوتی ہے، تو جہادی، جھگڑالو اور امن عامہ کے لیے خطرہ ہوتے ہیں''۔ ایک طویل تقریر کے بعد یوگی جی نے فیصلہ صادر کر دیا کہ: ''مسلمانوں کی آبادی کو کسی بھی معاشرے میں ۵ فی صد سے زیادہ نہیں بڑھنے دینا چاہیے۔ اس لیے ہندستان اور دیگر تمام ممالک کو مسلمانوں کی آبادی کو کنٹرول کرنے کے طریقے ڈھونڈنے چاہییے۔ ان کو مختلف علاقوں میں بکھرا کر اور ان کی افزایش نسل پر پابندی لگا کر ہی دینا میں امن و امان قائم ہوسکتا ہے۔ بس یہی مسئلہ کشمیر کا حل ہے۔ وہاں کی آبادی کو پورے ملک میں بکھیر کر وہاں بھاری تعداد میں ہندو آبادی کو بسایا جائے''۔

آج ان دو واقعات کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ معلوم ہو کہ کس ذہنیت کے افراد بھارت کے تخت پر براجمان ہیں۔ بھارت میں اس وقت کی حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی جب سے وجود میں آئی ہے، وہ لگا تار تین نکاتی ایجنڈے پر انتخابات لڑتی آئی ہے: ● بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر ● یونیفارم سول کوڈ کا نفاذ اور ● کشمیر کی آئینی خصوصی حیثیت ختم کرنا۔ اگرچہ اس سے قبل بی جے پی دوبار اقتدار میں رہی ہے، مگر اس نے عددی قوت کی کمی کے باعث ان تین ایشوز کو عملی جامہ پہنانے سے گریز کیا۔ اب ۲۰۱۹ء میں اکثریت کے ساتھ اقتدار میں واپس آئی تو بی جے پی کے لیڈروں نے کہا کہ: ''ہمارے کو ر ایجنڈے کو نافذ کرنے کا وقت آن پہنچا ہے''۔ ۲۰۱۴ء میں جب کشمیر میں مقامی پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ اور بی جے پی کے اتحاد سے مفتی سعید کی حکومت بنی، تو کہا گیا تھا کہ: ''بی جے پی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت کشمیر کو دیے گئے خصوصی اختیارات کو موضوعِ بحث نہیں بنائے گی''۔

اور پھر دفعہ ۳۷۰ کے ساتھ دفعہ ۳۵-اے کو نشانہ بنا دیا گیا۔ دفعہ ۳۵-اے کے تحت غیر ریاستی باشندوں کے نوکری حاصل کرنے، ووٹ دینے اور جایداد خریدنے پر پابندی عائد تھی۔ اس دفعہ کے ختم ہونے کے نتائج دفعہ ۳۷۰ کے خاتمے سے بھی زیادہ خطرناک ہوں گے۔

مسلم دشمنی اور متعصب ذہنیت کے حامل افراد کو آئین کی اسی طرح کی اور شقیں نظر نہیں آتیں، جو بھارت کے دیگر علاقوں، یعنی ناگا لینڈ، میزورام، سکم، اروناچل پردیش، آسام، منی پور، آندھرا پردیش اور گوا کو خاص اور منفرد حیثیت عطا کرتی ہیں۔ ان کے تحت وہاں بھی دیگر شہریوں کو

غیرمنقولہ جایدادیں خریدنے پر پابندی عائد ہے یا اس کے لیے خصوصی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

● **ایک پُراسرار کردار:** ۳۷۰ اور ۳۵-اے کو دستور سے خارج کرنے کے موجودہ فیصلے سے قبل، آر ایس ایس نے ان دونوں دفعات کو الگ الگ ہائی کورٹوں میں چیلنج کیا تھا۔ بی جے پی کے جس عہدے دار نے جموں وکشمیر کے جموں بنیچ کے سامنے دفعہ ۳۷۰ کو چیلنج کیا تھا، وہ صاحب اس وقت گورنر جموں وکشمیر کے مشیر فاروق خان ہیں۔ موصوف نے پولیس سے ریٹائر ہونے کے بعد بی جے پی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی ہے۔

یاد رہے مارچ ۲۰۰۸ء میں جب امریکی صدر بل کلنٹن نے دہلی کی سرزمین پر قدم رکھا تو جنوبی کشمیر کے گاؤں چھٹی سنگھ پورہ میں نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھوں ۳۶ سکھوں کا قتل عام ہوا تھا۔ فاروق خان ان دنوں پولیس کے اسپیشل آپریشنز گروپ میں ایس ایس پی تھے اور عمومی تاثر یہ تھا کہ واردات کے ذمہ دار یہی صاحب ہیں۔کلنٹن کی بھارت موجودگی کے دوران اعلان کر دیا کہ ''اس قتل عام کے ذمے دار لشکر طیبہ کے چاروں حملہ آور مار دیے گئے ہیں''۔ فاروق عبداللہ حکومت نے فاروق خان کو معطل کر کے جسٹس پانڈیان پر مشتمل عدالتی کمیشن کو سکھوں کے قتل کی تحقیقات کا حکم دیا۔مگر وہ اس بارے میں تو پوری طرح کام نہ کر سکے۔ تاہم جسٹس پانڈیان نے فاروق خان کو اُن چار افراد کے قتل کا حصّہ دار بتایا، جنھیں 'دہشت گرد' قرار دے کر مار دیا گیا تھا۔مگر پانڈان کی ہدایت کے باوجود فاروق خان کو نہ تو الزام لگا کر قتل کیے جانے والے مقدمے میں ماخوذ کیا گیا، اور نہ سکھوں کے قتل عام کے ضمن میں تفتیش کی گئی۔ ۲۰۰۳ء میں مفتی سعید حکومت نے بھی ان کے خلاف چارہ جوئی کی کوشش کی، لیکن جب ۲۰۰۸ء میں غلام نبی آزاد نے وزارتِ اعلیٰ سنبھالی، تو نئی دہلی کے حکم پر فاروق خان کو بحال کر دیا گیا۔ فاروق خان کے خلاف سکھوں میں آج بھی شدید ردعمل پایا جاتا ہے۔

دفعہ ۳۵-اے کا معاملہ

۱۹۴۷ء میں بھارت کی آزادی سے بہت پہلے کشمیر کے ہندو حکمران ہری سنگھ نے ایک حکم نامے کے تحت: ''شہریت اور غیرمنقولہ جایداد کی خرید کے علاوہ ریاستی حکومت میں 'غیر ملکیوں' پر پابندی عائد کر دی تھی''۔ ۲۰ راپریل ۱۹۲۷ء کے ایک نوٹیفیکیشن میں راجا ہری سنگھ نے 'ریاستی عوام' کی وضاحت کی تھی اور اسی قانون کو بعدازاں کشمیری اور بھارتی آئین میں شامل کر دیا گیا۔

کشمیری ہندو جنھیں 'پنڈت' کہتے ہیں، یہ قانون ان کے احتجاج کے ردعمل میں منظور کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس وقت 'کشمیر، کشمیریوں کا ہے' کا نعرہ بلند کیا تھا، کیونکہ پنجابی مسلمان انتظامیہ میں رسوخ حاصل اور زمینیں خرید رہے تھے۔ لیکن، ایک صدی گزرنے کے بعد کشمیری مسلمانوں کو وہی خدشات لاحق ہیں، جو ۱۹۲۰ء کے عشرے میں ہندوؤں کو لاحق تھے۔ ۱۹۲۰ء ہی کے عشرے میں، ہندوؤں نے راجا ہری سنگھ کو اس قانون میں ایک اور دفعہ شامل کرنے پر زور دیا تھا کہ: ''اگر ایک کشمیری خاتون، کسی غیر کشمیری سے شادی کرے تو وہ وراثت کے حق سے محروم ہو جائے گی''۔

مؤرخ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی کتاب *Kashmir Saga* (داستانِ کشمیر) میں لکھا ہے: ''کشمیر کے اندر 'غیر ملکیوں کا داخلہ بند ہے' کا شور و غوغا بذات خود کشمیری پنڈتوں نے بلند کیا تھا۔ مسلمانوں کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ ہندو حکمران نے انھیں ریاستی ملازمتوں سے بے دخل کر دیا تھا اور وہ اس قدر غریب تھے کہ اپنے ہی وطن میں زمین کا ٹکڑا بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ مسلمان اکثریت غربت میں ہولناک زندگی گزار رہی تھی۔ چیتھڑوں میں ملبوس، جن سے وہ بمشکل ہی اپنا بدن ڈھانپ سکتے تھے اور ننگے پاؤں۔ ایک مسلم کسان کا حلیہ، ریاستی خزانے کے بھرنے والے ایک فرد کے بجائے محض ایک فاقہ زدہ بھکاری ہی کا نظر آرہا تھا، جب کہ ہری سنگھ ہندونواز پالیسی کا علَم بردار تھا۔ جموں کے عوام، خاص طور پر راجپوت ہندوؤں نے زیادہ تر ملازمتیں حاصل کیں، جب کہ پنڈتوں کو پنجابیوں کی جگہ دفاتر میں کلرکوں کی حیثیت سے بھرتی کیا گیا۔ ایک حکم نامے کے ذریعے پنجابیوں کی ہر سطح پر بھرتی روک دی گئی''۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز کا کہنا ہے کہ: ''اس پورے قضیے میں کشمیری مسلمانوں کی کسی کو کوئی فکر نہیں تھی، اور نہ کوئی ان سے رائے لی جاتی تھی، ملازمت کے دروازے کشمیری مسلمان پر بند تھے۔ انتہائی خستہ حال اور غریب کشمیری مسلمان زیادہ تر کاریگر یا زرعی مزدور تھے۔ سوسائٹی میں ہندو ہونا عزت و توقیر کی علامت تھی۔ مسلمان کو صرف اپنے مذہب کی بنیاد پر حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا''۔ جب ۳۵-اے کا یہ قانون بنایا گیا تھا، تو اس وقت کسی کو مسلم خواتین کے حقوق یاد نہیں تھے۔ ایک صدی بعد انھی کشمیری پنڈتوں نے اس قانون کو ہٹانے کا مطالبہ اس لیے کیا ہے کہ اب کشمیری مسلمان تعلیم یافتہ اور ترقی کی دوڑ میں ان کے ہم پلہ ہو گئے ہیں۔ یہ قانون جو ایک

صدی قبل تک تو ٹھیک نظر آتا تھا، مگر اب پنڈتوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا''۔

'بھارت کے تکثیری کلچر اور تنوع میں اتحاد' جیسے نعرے مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، اور ان کے پیروکار، دنیا میں بھارت بیچا کرتے تھے۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ دفعہ ۳۷۰ کو کشمیری خواتین کے جسم پر موجود لباس سے تشبیہ دیتے تھے۔ ان کی نیشنل کانفرنس کا کشمیر میں مقبول انتخابی نعرہ ہوتا تھا: ''ازء ہوند عزت فضء ہوند عزت، ترہت ستت ترہت ستت''۔ ازء اور فضء کشمیر میں خواتین کے مقبول نام ہیں۔ اس نعرے کا مفہوم تھا کہ ''خواتین کی عزت و آبرو ۳۷۰ میں ہے''۔ شیخ عبداللہ صاحب سے تو میری ملاقات نہیں ہوسکی، تاہم ان کے فرزند اور سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ سے جب بھی مکالمہ ہوا تو وہ آزادی پسند جماعتوں پر طنزیہ جملے کستے تھے کہ: ''مسلم اکثریتی پاکستان میں ہم کشمیریوں کی انفرادیت کبھی کی ضم ہوگئی ہوتی، جب کہ بھارت کا جمہوری اور آئینی تکثیری معاشرہ ہی ریاست جموں و کشمیر کی وحدت اور ہماری کشمیری انفرادیت کا ضامن ہے''۔ ۵ /اگست ۲۰۱۹ء کو امیت شا نے پارلیمان کے ایوان بالا، یعنی راجیہ سبھا میں صبح ۱۱ بجے کشمیریوں کے تن بدن سے یہ زیر جامہ اُتار کر ان کو سرعام برہنہ کر دیا ہے۔ ہزاروں کلومیٹر دُور مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے بھرے بازار میں میری عزت بھی تارتار کر دی گئی ہو۔

دفعہ ۳۷۰، ممتاز قانون دان کی نظر میں

ممتاز قانون دان اور اُمورِ کشمیر پر گہری نظر رکھنے والے دانش ور جناب اے جی نورانی کے بقول: ''آرٹیکل ۳۷۰ اگرچہ ایک عبوری انتظام تھا، کیوں کہ حکومت ہند کی ۶۰ کے عشرے تک یہ پالیسی تھی کہ جموں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ استصواب راے سے کیا جائے گا۔ ۱۹۴۸ء میں جموں و کشمیر پر حکومت کے وائٹ پیپر میں سردار پٹیل کا یہ بیان موجود ہے: الحاق کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت ہند نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ اسے بالکل عارضی مانتی ہے، جب تک کہ اس بارے میں ریاست کے لوگوں سے ان کی راے نہیں معلوم کی جائے گی''۔

اے جی نورانی صاحب کے بقول: ''جن سنگھ کے بانی شیاما پرساد مکھرجی 'جن کا نام آرٹیکل ۳۷۰ کی مخالفت کرتے وقت بی جے پی اُچھالا کرتی ہے' انھوں نے اس کی مکمل حمایت کی تھی۔ بی جے پی اس وقت کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کا نام بھی اس پروپیگنڈے کے لیے استعمال

کرتی ہے کہ انھوں نے اس معاملے پر پنڈت جواہر لعل نہرو کی مخالفت کی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پٹیل نے بھی آئین کی اس دفعہ کی مکمل تائید کی تھی۔ اس خلط مبحث کے برعکس کشمیر واحد ریاست تھی، جس نے الحاق کے لیے اپنی شرائط پر حکومت سے مذاکرات کیے تھے۔ وہ ہندستان میں ضم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے الحاق کیا تھا۔ اس لیے بھارتی حکومت اور ریاست کے مطابق آرٹیکل ۳۷۰ دونوں کے درمیان ایک مقدس معاہدہ ہے۔ جس کی کسی شق میں کوئی بھی فریق یک طرفہ ترمیم نہیں کرسکتا۔ تاہم، ''این گوپال سوامی نے ۱۶/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو اس سلسلے میں پہلی 'خلاف ورزی' کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر مسودے میں تبدیلی کو پارلیمنٹ کی لابی میں حتمی شکل دی۔ جیسے ہی شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو اس تبدیلی کا علم ہوا، وہ دونوں ایوان کی طرف دوڑے، لیکن تب تک یہ ترمیمی بل پاس ہو چکا تھا، جو افسوس ناک اعتماد شکنی اور بداعتمادی کا معاملہ تھا۔ اگر اصل مسودہ پاس کیا جاتا تو ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کو اقتدار سے بے دخل کیا جانا ممکن نہ تھا''۔

ترکی کی نیوز ایجنسی سے بات کرتے ہوئے اے جی نورانی کا کہنا ہے کہ: ''سپریم کورٹ میں اس اقدام کو چیلنج کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ لیکن حکومتی فیصلے کی قانونی حیثیت کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے دورانیے اور وقت کے لحاظ سے بھارتی اعلیٰ عدلیہ کی رفتارِ کار کے مشکوک ہونے کا خطرہ موجود ہے۔ مودی حکومت نے بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ کی تمام دفعات کو منسوخ کرتے ہوئے دنیا کو حیران و ششدر کر دیا تھا جو جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت کا ضامن ہونے کے علاوہ ہندو اکثریت میں اس کی مسلم شناخت کی حفاظت کرنے کا تحفظ بھی کر رہا تھا۔ اس دفعہ کے تحت بھارت کے ساتھ خطے کے پیچیدہ تعلق کی بھی وضاحت کی گئی تھی۔ ان حالات میں اپنی اعتباریت اور شفافیت قائم رکھنے کی خاطر بادی النظر میں بھارتی سپریم کورٹ پر لازم ہے کہ اس فیصلے کو کالعدم قرار دے''۔

نورانی کے خیال کے مطابق: ''ان دفعات کی منسوخی نے کشمیری آبادی کی بقا کے لیے خطرات پیدا کر دیے ہیں۔ دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کرنے کا بھارتی اختیار تو ۱۹۵۶ء میں کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کی تحلیل کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ خصوصی حالات میں دفعہ ۳۷۰ سے مراد جموں و کشمیر کی شناخت کا اظہار تھا کہ جس میں اس کے بھارت سے الحاق کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ اس دفعہ کو منسوخ کرنے کے ذریعے ہندو قوم پرست حکومت کا مقصد یہ نہیں کہ کشمیر کو بھارت کے ساتھ متحد کیا جائے

بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کشمیری عوام کی شناخت ختم کی جائے''۔

نورانی نے کہا: ''قانونی لحاظ سے بھارتی پارلیمان کو یہ دفعہ منسوخ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اس مقصد کی خاطر ریاست جموں وکشمیر کی آئین ساز اسمبلی کی منظوری ضروری تھی۔ ریاستی حکومت کی طرف سے کوئی بھی منظوری ہمیشہ سے منتخب اسمبلی کی حتمی منظوری سے مشروط رہی ہے۔ جب ریاست گورنر یا صدر راج کے تحت ہو، کوئی بھی یہ رضامندی نہیں دے سکتا۔ اس لیے مرکزی حکومت اپنے کٹھ پتلی نامزد فرد کے ذریعے یہ منظوری حاصل نہیں کرسکتی اور زمینی حقائق یہ ہیں کہ اس وقت جموں وکشمیر پر صدر راج نافذ ہے۔ حالانکہ بھارتی آئین نے ازخود یہ وضاحت کر دی ہے کہ ریاستی حکومت سے مراد ریاست میں وزرا کی ایک کونسل ہے۔ اور اس وقت تو کشمیر کے وزیراعلیٰ کی سربراہی میں وزرا کی کسی بھی قسم کی کوئی کونسل بھی موجود نہیں''۔

نورانی صاحب نے مزید بتایا: ''کشمیر کی موجودہ صورتِ حال پر سری لنکا کی سپریم کورٹ کے نومبر ۲۰۱۲ء کے فیصلے کا اطلاق ہوتا ہے، جس میں سری لنکا حکومت کا یہ فیصلہ مسترد کر دیا تھا، جسے صوبائی کونسل کی توثیق حاصل نہیں تھی۔ اُس وقت دو درخواستوں کے ذریعے Divineguma Bill کو سری لنکا سپریم کورٹ کے روبرو چیلنج کیا گیا تھا کہ شمالی سری لنکا میں کسی صوبائی کونسل کی غیرموجودگی میں، گورنر نے شمالی صوبے کی طرف سے قانون کی توثیق کی تھی۔ یہ درخواستیں 'تامل نیشنل الائنس' نے کی تھیں۔ یکم نومبر کو سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ گورنر، صوبائی کونسل کی جگہ اس قانون کی توثیق نہیں کرسکتا''۔

اے جی نورانی کہتے ہیں کہ: ''آئین کی دفعہ ۲۴۹ کے تحت جاری کردہ 'صدارتی حکم نامہ' جس کا اطلاق کشمیر پر بھی کیا گیا، اس کا تعلق ریاست کی فہرست سے تھا اور مرکز کے مقرر کردہ گورنر نے اس کی توثیق کی تھی۔ یہ چالاکی لاسکریٹری کی مخالفت اور ریاستی کابینہ کی عدم موجودگی میں انجام دی گئی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں کشمیر اسمبلی کے بدترین دھاندلی زدہ انتخابات کے انعقاد سے کشمیر میں بھارت کے جمہوری دعووں کی قلعی کھل گئی۔ انتخابی دھاندلیوں کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے گئے۔ تمام امیدوار 'بلامقابلہ' منتخب قرار پائے۔ یہ وہی اسمبلی تھی، جس نے ریاست کا دستور وضع کیا اور الحاق کے دستاویز کی 'توثیق' کی تھی۔ یہ اسمبلی ریاست کی مستقبل گری اور اس کی حیثیت طے کرنے کے سلسلے میں دستور ساز اسمبلی کا درجہ رکھتی تھی۔ کشمیر کی اس آئین ساز اسمبلی کی حقیقت اور حیثیت کی قلعی خود

اس وقت کے انٹیلی جنس سربراہ بی این ملک نے یہ کہہ کر کھول دی: ’’ان امیدواروں کے کاغذات نامزدگی کو مسترد کر دیا گیا، جو حزب مخالف کا کردار ادا کرنے کی اہلیت رکھتے تھے‘‘۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ الحاق کی مبینہ دستاویز کی توثیق اور کشمیر کے آئین کی منظوری کو کوئی عوامی تائید حاصل نہیں تھی‘‘۔

یاد رہے امیت شا ایک اور منصوبے پر بھی کام کر رہے ہیں۔ اس کے تحت غالباً نومبر، دسمبر میں کشمیر میں ہونے والے برائے نام اسمبلی کے لیے انتخابات میں ہندو اکثریتی خطے جموں کی تمام نشستوں پر بی جے پی کے امیدواروں کو کامیاب بنانا ہے، اور ساتھ ہی وادیِ کشمیر کی مطلوب نشستوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے، جن پر جموں اور دہلی میں مقیم کشمیری پنڈتوں کے ووٹوں کی رجسٹریشن کا کام سرعت سے جاری ہے، تاکہ ان کے پوسٹل بیلٹوں کے ذریعے ان علاقوں میں بھی بی جے پی کے امیدواروں کی کامیابی یقینی بنائی جائے۔ اس حکمت عملی کا مقصد ریاست میں مسلمان ووٹوں کو بے اثر کرنا ہے۔ کشمیر اسمبلی کی اب ۸۲ نشستیں رہ گئی ہیں۔ امیت شا نے پارلیمنٹ میں بل پیش کرتے وقت بتایا ہے کہ: ’’اسمبلی حلقوں کی از سر نو حد بندی ہوگی‘‘۔ فی الحال ۳۷ نشستیں جموں، ۴۵ نشستیں وادی کشمیر خطے سے ہیں۔ کشمیر اسمبلی میں ۲۴ مزید نشستیں آزاد کشمیر و گلگت کے لیے مختص رکھی گئی ہیں، جو خالی رہیں گی۔ ان میں سے آٹھ نشستیں پاکستان سے ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں آئے ہندو پناہ گزینوں کے لیے وقف کی جائیں گی، تاکہ اسمبلی میں ان کی نمایندگی ہو اور ہندو ممبران کی تعداد میں بھی اضافہ ہو۔

کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت حکمران ہندو قوم پرست بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈران کی نظروں میں برسوں سے کھٹک رہی تھی۔ اس پارٹی نے صوبوں و مرکز کے اختیارات کے تعین کرنے والے سرکاری کمیشن کے سامنے صوبوں کو انتہائی حساس سکیورٹی کے علاوہ بقیہ سبھی اختیارات تفویض کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ حال ہی میں جنیوا میں بھارت کے سفیر نے سری لنکا کو مشورہ دیا تھا کہ: ’’وہ اپنے آئین کی ۱۳ویں ترمیم کو جلد از جلد لاگو کر کے شمالی سری لنکا میں مقیم تامل ہندو اکثریت کو تحفظ اور پاور فراہم کرے‘‘۔ یعنی اوروں کو نصیحت، خود میاں فضیحت۔ کشمیر چونکہ مسلم اکثریتی خطہ ہے، اس لیے بھارتی حکمرانوں کے نزدیک انسانی حقوق وہاں لاگو نہیں ہوتے۔

چین سے بھارتی سفارت کاری

چین کے عالمی امور میں رویے اور بین الاقوامی میڈیا کی کوریج کی وجہ سے، اپنی تمام تر معاشی قوت کے باوجود سفارتی محاذ پر بھارت ایک طرح سے دبی دبی پوزیشن پر چلا گیا ہے۔ اس لیے اب بھارت کی کوشش ہے کہ ستمبر ۲۰۱۹ء میں سرحدی تنازعے پر ہونے والے مذاکرات میں، چین کو کوئی بھاری پیش کش کرے۔ سرحدی تنازعے سے متعلق دونوں ممالک کے خصوصی نمایندوں اجیت دوبال اور چینی وزیر خارجہ وانگ ہی کے درمیان اس ملاقات میں، بھارت، چین کو بتا سکتا ہے کہ: ''ریاست جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت دینے والی دفعہ ۳۷۰ کی وجہ سے ہی وہ لداخ خطے میں چین کے ساتھ سرحدی تنازعے کو سلجھا نہیں پا رہا تھا۔ جموں و کشمیر کی اس خصوصی حیثیت کے ختم ہونے کے بعد اب چونکہ بھارتی آئین کی سبھی دفعات کا اطلاق جموں و کشمیر پر ہوتا ہے، نیز لداخ اب براہِ راست نئی دہلی کے زیر انتظام آ گیا ہے، اس لیے اب چین کے ساتھ سرحدی تنازعات کو سلجھانا بھارت کے لیے آسان ہو گیا ہے''۔

چین کے سابق خصوصی نمایندے دائی بینگو نے ایک عشرہ قبل تجویز پیش کی تھی: ''بھارت اگر لداخ کے علاقے میں 'اکسائی چن' کے دعوے سے دست بردار ہو جائے، تو چین بھی مشرقی بھارت میں اروناچل پردیش پر اپنا دعویٰ واپس لے سکتا ہے''۔ اس کے علاوہ بھارت، گلگت اور 'سی پیک' کے حوالے سے اپنے اعتراضات کو بھی ختم کرنے پر تیار ہو سکتا ہے، تا کہ اس تجارتی راستے کو چین بھارت تجارت کے لیے برتا جا سکے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے اور چین، کشمیر کے حوالے سے اپنے موقف کو لچک دار بنا کر بھارت سے مادی مفادات کو دو تین گنا بڑھا لیتا ہے، تو پھر اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ پاکستان سے چینی تعلقات کا وہ بلند مقام متاثر ہو، جو گذشتہ ۶۰ برسوں سے بلند معیار پر چلا آ رہا ہے۔ اس لیے پاکستان کو سفارت کاری کے میدان میں بڑی محنت اور حد درجہ ہوشیاری سے کام لینا ہوگا، جب کہ بھارت پہلے ہی مسلم دنیا میں سفارتی اور مضبوط معاشی پیش رفت کر چکا ہے۔

کشمیر کا مستقبل

آج کشمیری قوم کا تشخص اور اس کی انفرادیت پامال ہو چکی ہے۔ امن عالم کے دعوے دار ایک طرف افغانستان میں امن قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں، دوسری طرف خطے میں افغانستان

سے زیادہ خطرناک ماحول پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے، بھارتی حکومت کی طرف سے اٹھایا گیا یہ قدم، فلسطین میں اسرائیلی جارحانہ کارروائیوں سے بھی کہیں زیادہ سنگین ترین ہے۔ پوری دنیا میں یہودی ایک کروڑ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس سے آدھے ہی اسرائیل میں رہتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو بھی عرب ممالک یا پورے فلسطین کا آبادیاتی تناسب بگاڑ نہیں سکتے۔

ان کے برعکس کشمیر میں تو مقامی مسلمانوں کا مقابلہ ایک ارب ۱۰ کروڑ بھارتی غیرمسلموں کی آبادی کے ساتھ ہے، جو چند ماہ میں ہی خطے کا آبادیاتی تناسب بگاڑ کر کشمیری عوام کو اپنے ہی گھروں میں اجنبی بنا دیں گے۔ سابق بھارتی فوجیوں اور ریٹائرڈ بیوروکریٹوں اور ان کے اہل خانہ کو کشمیر میں بسانے کی مہم تو پہلے سے ہی جاری ہے۔ وزیراعظم مودی نے ایک دلیل یہ بھی دی، کہ: ''بیرون ریاست بیورکریٹ کشمیر جانے سے کتراتے ہیں، کیونکہ وہ اور ان کے اہل خانہ وہاں زمین نہیں خرید سکتے ہیں''۔ جب بھارت، برطانوی سامراجی تسلط سے آزادی مانگ رہا تھا، تو ایک بار برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے کانگریسی لیڈروں کو مخاطب کر کے کہا: ''تم کو آزادی اس لیے چاہیے کہ دبے کچلے طبقوں اور مظلوموں پر حکومت کر کے ان کو دبا دو''۔

کشمیر ایک شدید صدمے سے دوچار ہے، اور ابھی شاید ویسے ردعمل کا اظہار نہیں کر پائے گا، جس کی بظاہر توقع کی جا رہی ہے۔ یہ ایک پُرفریب آتش فشاں کی سی خاموشی ہے۔ ۱۹۸۷ء کے انتخابی دھاندلی زدہ انتخابات کا بدلہ کشمیریوں نے ۱۹۸۹ء میں چکایا۔ کشمیر میں نئے مزاحمتی کلچر کا آغاز تو ہو چکا ہے، جس میں فکری مزاحمت کا مرکز مظلومیت کے بجائے تخلیقی سطح پر یادوں کو اُجاگر کر کے باوقار طور پر اُبھرنے کی صلاحیت حاصل کرنا ہے۔

بھارتی آئین کی دفعہ ۳۷۰ اور دفعہ ۳۵-اے کے خاتمے کے ساتھ بظاہر کاغذوں میں ریاست جموں و کشمیر تحلیل ہوگئی ہے، مگر قانونِ قدرت تحلیل نہیں ہوسکتا۔ تاریخ کا پہیہ ساکت نہیں رہتا، یہ گھومتا ہے اور اس قوم کے لیے خاصا بے رحم ثابت ہوتا ہے، جو اکثریت اور طاقت کے بل بوتے پر کمزور اور ناتواں کی زندگیاں اجیرن بنا دے۔ ۱۹۸۴ء میں تہاڑ جیل میں پھانسی سے قبل مقبول بٹ نے کہا تھا کہ: ''میری بے بسی پر مت مسکراؤ، تم اپنی خیر مناؤ، کہ ظلم کی سیاہ رات جاتی ہے''۔ اور صرف چھے سال بعد ۱۹۸۹ء میں کشمیر نے کروٹ لی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا!